بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

اسلامی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے نیم پختہ یا بالکل خام نوجوانوں کے مذہبی خیالات پر مغربی تعلیم و تہذیب کا جو اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ، ان تحریروں اور تقریروں سے ہو سکتا ہے جو اس قسم کے لوگوں کی زبان و قلم سے آئے دن نکلتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک تازہ نمونہ ملاحظہ ہو۔

سید مقبول احمد صاحب صوبہ متحدہ کے ایک مسلمان گریجویٹ جو غالباً ڈپٹی کلکٹر بھی ہیں، کچھ مدت ہوئی کہ چین و جاپان کی سیاحت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ ان کا سفر نامہ گورکھ پور کے رسالہ "ایوان" میں شائع ہو رہا ہے۔ ہانگ کانگ کے حالات تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ہمارے ساتھ جتنے چینی مسافر ہیں وہ انتہا کے بلانوش اور شراب خوار ہیں۔ سور کا گوشت تو اُن کی جان ہے...... اب میں نے عیسائیت کی ترقی کا راز سمجھا۔ چین اپنے قدیم مذہب کی پیروی کو نئی تعلیم کے ساتھ عار پاتا ہے۔ اس کو اسلام قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا اگر وہ اس کو سمجھتا ہوتا مگر اسلام کا حکم اسکی تمام مرغوب غذا سے محروم کر دیتا ہے۔ چار و ناچار وہ عیسائی ہو جاتا ہے......

کچھ عجب نہیں کہ آیندہ چین کا سرکاری مذہب عیسائیت ہو جائے۔ میں سور کے گوشت کے معاملہ میں اہل یورپ اور اہل چین کے نو مسلموں میں ذرا ڈھیل دینا پسند کرتا ہوں قرآن سے بھی

مجھے اسکے قطعی حرام ہونے میں شک ہے۔ زیادہ برین نیست کہ اہل عرب کے لیے کسی خاص وجہ سے حرام کر دیا گیا ہو۔ مگر ایسے ممالک میں جہاں اس کے بغیر فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟

بہرحال قرآن کا یہی ایک حکم ہے جس کی ممانعت عمومی کی علت میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی۔ ورنہ اصولاً معدہ او محرکات اخلاق میں اس قدر بُعد ہے کہ مذہب ہمارے کھانے کا مینو MENU بھی تیار کرے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم کو آہن گری اور زرگری خیاطی وغیرہ کا کام بھی کیوں نہ سکھائے۔ میرا خیال ہے کہ دنیائے اسلام کے ترقی نہ کرنے کا راز اسی میں پنہاں ہے کہ وہ آدمی کے تمام حقوق انسانی سلب کر کے اس کو ایک لاشۂ بے جان اور ایسا بچہ بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی دنیاوی ترقی کی راہیں سب بھول جاتا ہے۔ ورنہ مذہب حقیقۃً اسی قدر ہونا چاہیئے جیسا عیسائیوں نے سمجھ رکھا ہے۔"

اس کے بعد وہ شنگھائی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"خدا کی اس بے شمار خلقت کو خوش وخرم وخوشحال دیکھ کر دل گوارا نہیں کرتا کہ یہ تمام کے تمام چند سال کے بعد دوزخ کے ایندھن بنائے جائیں گے گویا ان کی پیدائش کا یہی ایک مقصد خدا کے پاس رہ گیا ہے۔ پھر یہ سب کے سب الا ماشاء اللہ چند نفوس کے علاوہ اگر بت پرست اور کافر ہیں تو انھوں نے دوزخ میں رکھے جلانے کے لیے کیا یہی قصور کیا ہے کہ انہوں نے خدا کی زمین کو معمور کر دیا ہے؟ نہ وہ حاجیوں کو قتل وغارت کرتے ہیں، نہ ان میں قوم لوط کا عمل ہے، نہ وہ کسی کے مال کو ہضم کر لیتے ہیں اور نہ اس کو جائز کرنے کے لیے تاویلیں کرتے ہیں۔ خاموشی سے اس زندگی کو بہت خوبی سے طے کر رہے ہیں، پھر بھی وہ مستحق دوزخ ہیں۔ آخر کیوں؟ ....

یقیناً مشرکانہ عقیدہ ایک سودائے خام ہے۔ لیکن یہ تو بتادو کہ اگر ایک شخص ایک ایسی ہستی کا فطرتاً قائل ہوجاتا ہے جو اس کو مارتا اور جلاتا ہے تو محض اس لیے کہ اسکی ماہیت اسکی سمجھ سے اتنی ہی باہر ہے جتنی ہماری سمجھ سے، یا وہ عربی کو خدا کی زبان نہیں سمجھتا، تم اس کے دشمن ہو اور وہ تمہارا دشمن ہوجاتا ہے۔ مگر نہیں! تمہارے نزدیک یہ سب کچھ ضروری نہیں ہے۔ ضروری تو یہ ہے کہ پائجامہ ایک خاص وضع کا ہو۔ کرتے کی کاٹ ایسی ہو۔ فلاں قسم کا کھانا کھائے۔ منہ پر چار انگل کی ڈاڑھی ہو۔ کبھی اپنے ملکی مدرسوں میں قدم نہ رکھے اس واسطے کہ وہاں مذہب کی زبان اور مذہب کا فن تم کو نہیں سکھایا جاتا۔"

جاپان کے بندرگاہ کوبے کے متعلق فرماتے ہیں:-

"دو گھنٹے تک میں کوبے میں پھرتا رہا۔ ایک بھیک مانگنے والا مجھ کو نہ ملا اور کوئی پھٹے پرانے کپڑے میں بدحال ملا۔ یہ ہے اس قوم کی ترقی کا حال جو نہ مذہب کو جانتی ہے اور نہ خدا کو۔"

پھر وہ بقول خود "موعظۂ حسنہ" شروع کرتے ہیں:-

"یاد رکھو کہ احسان اصل دین ہے اور احسان کسی زبان اور فن کا محتاج نہیں۔ اس کا فطری مقصد یہ ہے کہ ہم آئندہ زندگی میں یا خود اس زندگی میں اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور ہونگے یہی در اصل مذہب اسلام ہے۔ اس سے زیادہ جس چیز کا تم نے مذہب نام رکھا ہے وہ محض تمہارے نفس کا ڈھکوسلا یا تمہارے دماغ کا خلل ہے۔ جس روز ان دونوں باتوں پر مذہب کو محدود کر دوگے اور اپنی ساری بیڑیاں شریعت کی توڑ ڈالوگے، تم بھی قوموں کے ساتھ بام ترقی پر پہنچوگے۔ بلکہ یوں کہو کہ تم قوموں میں ضمیر پیدا کروگے جن کے ہاتھ سے اگر دنیا نہیں گئی ہے تو آسمانی بادشاہت بھی نہ جائے گی۔ تم خود کوئی قوم نہیں ہو بلکہ قوموں کے مصلح ہو۔ مگر خدارا اس کا موقع تو نہ دو کہ

کوئی کہے کہ فلاں قوم برسرِ عروج ہے مگر جو اُس میں مسلمان ہیں ان کی حالت زبوں ہے، او یقیناً اس زبونی کا ذمہ داران کا عجیب و غریب مذہب ہے۔"

یہ تحریر ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کی عام دماغی حالت کا ایک واضح نمونہ ہے۔ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے، مسلم سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے پلے بڑھے، مسلمانوں کے ساتھ معاشرت و تمدن کی بندشوں میں بندھے، اس لیے اسلام کی محبت، مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی، اور مسلمان رہنے کی خواہش گویا ان کی گھٹی میں پڑی اور ان کے دلوں میں اس طور پر بیٹھ گئی کہ اس میں ان کے ارادے، اور ان کی اپنی عقلی و فکری قوتوں کا دخل نہ تھا۔ مگر قبل اس کے کہ اس اضطراری اور غیر شعوری اسلام کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے اختیاری اور شعوری اسلام بنایا جاتا، اور ان میں یہ صلاحیت پیدا کی جاتی کہ وہ اسلامی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ کر مسلمان ہوتے اور عملی زندگی میں اس کے احکام و قوانین کو برت کر بھی دیکھ لیتے، انہیں انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیا گیا جہاں ان کے قوائے ذہنی و فکری کی پرورش بالکل غیر اسلامی تعلیم و تربیت میں ہوئی اور ان کے دماغوں پر مغربی افکار اور مغربی تہذیب کے اصول اس طرح چھا گئے کہ ہر چیز کو وہ مغرب کی نظر سے دیکھنے اور ہر مسئلہ پر مغرب ہی کے ذہن سے غور کرنے لگے، اور مغربیت کے اس استیلاء سے آزاد ہو کر سوچنا اور دیکھنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ مغرب سے انھوں نے عقلیت RATIONALISM کا سبق ضرور سیکھا، مگر خود عقل ان کی اپنی نہ تھی بلکہ یورپ سے حاصل کی ہوئی تھی، اس لیے ان کی عقلیت درحقیقت فرنگی عقلیت ہو گئی نہ کہ آزاد عقلیت۔ انھوں نے مغرب سے تنقید (CRITICISM) کا بھی درس لیا، مگر یہ آزاد تنقید کا درس نہ تھا، بلکہ اس بات کا درس تھا کہ مغرب کے اصولوں کو برحق مان کر ان کے معیار پر ہر اس چیز کو جانچو جو مغربی نہیں ہے، لیکن خود مغرب کے اصولوں کو تنقید سے بالاتر سمجھو۔ اس تعلیم و تربیت کے بعد جب یہ لوگ کالجوں سے فارغ ہو کر نکلے، اور زندگی کے میدانِ عمل میں انھوں نے قدم رکھا تو ان کے دل اور دماغ میں بُعد المشرقین واقع ہو چکا تھا۔ دل مسلمان تھے اور دماغ غیر مسلم۔ رہتے مسلمانوں میں تھے، شب و روز کے معاملات مسلمانوں کے ساتھ تھے، تمدن و معاشرت کی بندشوں میں مسلمانوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے،

اپنے گرد و پیش مسلمانوں کی مذہبی و تمدنی زندگی کے اعمال دیکھ رہے تھے، ہمدردی و محبت کے رشتے مسلمانوں سے وابستہ تھے، مگر سوچنے اور سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی جتنی قوتیں تھیں وہ سب مغربی سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھیں، جن سے نہ اسلام کا کوئی قاعدہ مطابقت رکھتا تھا اور نہ مسلمانوں کا کوئی عمل۔ انھوں نے مغربی معیار کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کی ہر چیز پر تنقید شروع کی اور ہر اس چیز کو غلط اور قابلِ ترمیم سمجھا جسے اس معیار کے خلاف پایا، خواہ وہ اسلام کے اصول میں سے ہو یا فروع میں سے، یا محض مسلمانوں کا عمل ہو۔ ان میں سے بعض نے تحقیقِ حال کے لیے کچھ اسلام کا مطالعہ بھی کیا مگر تنقید و تحقیق کا معیار وہی مغربی تھا۔ ان کی ذہنیت کے ٹیڑھے سوراخ میں اسلام کی سیدھی میخ آخر بیٹھتی تو کیونکر؟

مذہبی مسائل پر جب یہ حضرات اظہارِ خیال کرتے ہیں تو ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے تقریر فرما رہے ہیں۔ نہ ان کے مقدمات درست ہوتے ہیں، نہ منطقی اسلوب پر ان کو ترتیب دیتے ہیں، اور نہ صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کلام کرتے وقت خود اپنی پوزیشن بھی متعین نہیں کرتے۔ ایک ہی سلسلۂ کلام میں مختلف حیثیتیں اختیار کر جاتے ہیں، ابھی ایک حیثیت سے بول رہے تھے کہ دفعتہً ایک دوسری حیثیت اختیار کر لی اور اپنی پچھلی حیثیت کے خلاف بولنے لگے۔ سستی فکر ان کے مذہبی افسانات کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مذہب کے علاوہ جس مسئلے پر بولیں گے ہوشیار اور چوکنے ہو کر بولیں گے۔ کیونکہ وہاں اگر کسی قسم کی بے ضابطگی ہو گئی تو جانتے ہیں کہ اہلِ علم کی نگاہ میں کوئی وقعت باقی نہ رہے گی۔ لیکن مذہب چونکہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور اس کو وہ اتنا وزن ہی نہیں دیتے کہ اس پر کلام کرتے وقت اپنے دماغ پر کچھ زور دینا ضروری سمجھیں، اس لیے یہاں وہ بالکل بے فکری کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی گفتگو فرماتے ہیں، گویا کھانا کھا کر آرام کرسی پر دراز ہیں اور محض تفریح کے طور پر بول رہے ہیں جس میں ضوابطِ کلام کو ملحوظ رکھنے کی کوئی حاجت ہی نہیں۔

دوسری بات جو ان کی تحریروں میں نمایاں نظر آتی ہے وہ خیالات کی سطحیت اور معلومات کی کمی ہے۔ مذہب کے سوا کسی اور مسئلے میں وہ اتنی کم معلومات اور اس قدر کم غور و فکر کے ساتھ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ وہاں اگر تحقیق کے

بغیر ایک کلمہ منہ سے نکل جائے تو آبرو جاتی رہے۔ لیکن مذہب کے معاملہ میں وہ تحقیق اور مطالعہ اور غور و فکر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ سرسری طور پر جو کچھ معلوم ہو گیا اسپر رائے قائم کر لی اور بے تکلف اس کو بیان کر دیا۔ اس لیے کہ کسی گرفت کا یہاں خوف ہی نہیں۔ گرفت اگر کرے گا تو مولوی کرے گا۔ اور مولوی کے متعلق یہ بات پہلے ہی اصول موضوعہ کے طور پر داخلِ مسلمات ہو چکی ہے کہ وہ تاریک خیال، دقیانوسی، اور تنگ نظر ہوتا ہے۔

فاضل محترم جناب سید مقبول احمد صاحب کی تحریر ان دونوں خصوصیات کی حامل ہے۔ سب سے پہلے تو ان کے مضمون سے یہی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مسلم کی حیثیت سے کلام کر رہے ہیں یا غیر مسلم کی حیثیت سے ہے۔ اسلام کے متعلق گفتگو کرنے والے کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ یا وہ مسلم ہوگا یا غیر مسلم۔ جو شخص مسلم کی حیثیت سے کلام کرے گا عام اس سے کہ وہ خوش عقیدہ ORTHODOX ہو، یا آزاد خیال یا اصلاح طلب، بہر حال اس کے لیے لازم ہوگا کہ دائرۂ اسلام کے اندر رہکر کلام کرے یعنی قرآن کو منتہائے کلام FINAL AUTHORITY سمجھے اور ان اصول دین و قوانین شریعت کو تسلیم کرے جو قرآن نے مقرر کئے ہیں، کیونکہ اگر وہ قرآن کی سند کو نہ مانے گا اور کسی ایسی بات میں کلام کی گنجائش سمجھے گا جو قرآن سے ثابت ہو، تو دائرہ اسلام سے باہر نکل آئے گا، اور اس دائرے سے نکلنے کے بعد اسکی مسلمانہ حیثیت باقی ہی نہ رہے گی کہ وہ اس میں کلام کر سکے۔ رہی دوسری حیثیت یعنی یہ کہ بولنے والا غیر مسلم ہو، تو اس حیثیت میں اسے پورا حق ہوگا کہ قرآن کے اصول اور اس کے احکام پر جیسی چاہے تنقید کرے، اسلیے کہ وہ اس کتاب کو منتہائے کلام نہیں مانتا۔ لیکن یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد اسے مسلم کی حیثیت سے گفتگو کرنے اور مسلمان بن کر مسلمانوں کو اسلام کے معنی سمجھانے اور اسلام کی ترقی کے وسائل بتانے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ ایک صاحب عقل و شعور آدمی جب سوچ سمجھ کر اسلام کے متعلق گفتگو کرے گا تو وہ سب سے پہلے یہ فیصلہ کرے گا کہ وہ ان دونوں حیثیتوں میں سے کون سی حیثیت اختیار کر سکتا ہے، پھر وہ جو حیثیت بھی اختیار کرے گا اس کے عقلی شرائط کو ملحوظ رکھے گا۔ کیونکہ بیک وقت اپنے آپ کو مسلمان بھی کہنا اور قرآن کے مقرر کئے ہوئے اصول و قوانین پر نکتہ چینی کا حق بھی استعمال کرنا، قرآن کی سند میں کلام بھی کرنا اور مسلمانوں کو

موعظہ حسنہ بھی سنانا کسی عاقل کا فعل نہیں ہو سکتا۔ نقیضین کو جمع کرنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی شخص بیک وقت مسلم بھی ہو اور غیر مسلم بھی۔ دائرہ اسلام میں داخل بھی ہو اور اس سے خارج بھی۔

اگر سید صاحب اسلام کے سوا کسی دوسرے مسئلے پر کلام فرماتے تو ہم ان کے متعلق یہ بدگمانی نہیں کر سکتے کہ وہ اس طرح دو مختلف حیثیتیں بیک وقت اپنے اندر جمع کر لیتے۔ ہم ان سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ قیصر ہند کی عدالت میں بیٹھ کر قیصر ہند کے اعتماد رکھے ہوئے قوانین پر نکتہ چینی کرنے کا حق استعمال فرمائیں گے۔ نہ ہم ان سے اس جرأت کی امید رکھتے ہیں کہ وہ کسی مذہب فکری SCHOOL OF THOUGHT کی پیروی کا دعویٰ کرنے کے بعد ان اصولوں پر مخالفانہ نکتہ چینی کریں گے جن پر وہ مذہب قائم ہے۔ لیکن یہ طرفہ ماجرا ہے کہ اسلام کے معاملہ میں موصوف نے دو بالکل متخالف حیثیتیں اختیار کی ہیں، اور یہ محسوس تک نہیں کیا کہ وہ بار بار اپنی پوزیشن بدل رہے ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مسلمانوں کا سا نام رکھتے ہیں، مسلمانوں کی زبوں حالی پر اظہار رنج فرماتے ہیں، اسلام کی ترقی کی خواہش ظاہر کرتے ہیں، مسلمانوں کو "احسان"، یعنی "اصل دین"، کا وعظ سناتے ہیں۔ دوسری طرف اس کتاب کے مقرر کئے ہوئے اصول اور قوانین پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں جس پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور جس کو آخری سند تسلیم کرنا مسلمان ہونے کی لازمی شرط ہے۔ قرآن ایک جگہ نہیں چار جگہ بالتصریح تمام مسلمانوں کے لیے سور کے گوشت کو حرام قرار دیتا ہے مگر آپ اس معاملہ میں ڈھیل دینا پسند فرماتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ "ترقی اسلام" کے لیے (خدا جانے قرآن سے باہر وہ کون سا اسلام ہے جس کی ترقی آپ چاہتے ہیں؟) قرآن فی الواقع انسان کے لیے کھانے کا مینو طیار کرتا ہے، کھانے کی چیزوں میں حرام و حلال، خبیث و طیب کا فرق قائم کرتا ہے اور صاف کہتا ہے کہ تم اپنے اختیار سے کسی شے کو حلال اور کسی کو حرام قرار دینے کا حق نہیں رکھتے۔ مگر آپ کو اپنے اس حق پر اصرار ہے اور خود قرآن کا یہ حق تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ وہ کھانے پینے میں مذہب کو دخل دے۔ قرآن مذہب کو ان حدود میں محدود نہیں رکھتا جن میں سینٹ پال (نہ کہ مسیح ؑ) کے متبعین نے اسکو محدود کیا ہے اور

لباس، اکل و شرب، نکاح و طلاق، وراثت، لین دین، سیاست، عدالت، تعزیرات وغیرہ کے قوانین وضع کرتا ہے، مگر آپ اس پر سختی کے ساتھ اعتراض کرتے ہیں، اس کو "ترقی اسلام" میں مانع قرار دیتے ہیں، اس کو الزام دیتے ہیں کہ وہ انسان کو ایک لاشہ بے جان اور بے بس بچہ بنا دیتا ہے، اور تجویز کرتے ہیں کہ مذہب بس اسی قدر ہونا چاہیئے جس قدر عیسائیوں (درحقیقت پولوسیوں) نے سمجھا ہے۔ قرآن نے خود قوانین شریعت بنائے ہیں اور ان کو حدود اللہ سے تعبیر کرکے ان کی پابندی کا حکم دیا ہے مگر آپ شریعت کی ان حدوں کو "بیڑیوں" سے تعبیر کرتے ہیں، اور سینٹ پال کی طرح مذہب کی توسیع و ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان بیڑیوں کو توڑ ڈالا جائے۔ قرآن کے نزدیک ایمان نجات کی پہلی اور لازمی شرط ہے، اور جو لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے ان کے متعلق وہ بالفاظ صریح کہتا ہے کہ وہ دوزخ کا ایندھن بنائے جائیں گے خواہ وہ بے شمار ہوں یا شمار میں آجائیں، خوش حال ہوں یا بدحال۔ مگر آپ کا حال یہ ہے کہ کافروں اور بت پرستوں کی بے شمار خلقت کو خوش و خرم و خوشحال دیکھ کر آپکا دل گواہی نہیں دیتا کہ چند سال کے بعد وہ سب دوزخ کا ایندھن بنا دیئے جائینگے اور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے خدا کی زمین کو معمور کر دینے کے سوا اور کون سا قصور کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن سے اتنا کھلا ہوا اختلاف رکھتے ہوئے آپ مسلمان کیسے رہ سکتے ہیں، اور مسلمان ہوتے ہوئے قرآن سے اختلاف کیونکر کر سکتے ہیں؟ اگر آپ مسلمان ہیں تو قرآن سے اختلاف نہ فرمائیے اور اگر قرآن سے اختلاف کرنا چاہتے ہیں تو دائرہ اسلام سے باہر کھڑے ہو کر اختلاف کیجئے۔

جو شخص کسی مذہب کے اصول اور احکام و قوانین سے مطمئن نہ ہو، جس کا دل ان کی صداقت پر گواہی نہ دیتا ہو، جو ان کی علت و مصلحت کو سمجھنے سے عاجز ہو، اور جس کے نزدیک ان میں سے بعض یا اکثر باتیں قابل اعتراض ہوں، اس کے لیے دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ یا تو وہ اس مذہب سے نکل جائے۔ پھر اس کو حق ہے کہ اس مذہب کے جس قاعدے اور جس حکم پر چاہے نکتہ چینی کرے۔ یا اگر وہ اس عدم اطمینان کے باوجود اس مذہب میں رہنا چاہتا ہے تو اس کے خلاف مناظرہ کرنے سے احتراز کرے، اور مجتہدین کو اس کے قواعد و ضوابط پر تیشہ چلانے کے بجائے طالب علم بن کر

اپنے شکوک و شبہات حل کرنے کی کوشش کرے۔ عقل و دانش کی رو سے تو اس حالت میں یہی دو طریقے معقول ہو سکتے ہیں، اور مرد عاقل جب کبھی ایسی حالت میں مبتلا ہوگا تو انہی میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کرے گا۔ لیکن مقبول مگر صاحب اور ان کی طرح بہت سے فرنگی تعلیم و تربیت پائے ہوئے حضرات کا حال یہ ہے کہ پہلا طریقہ اختیار کرنے کی اخلاقی جرأت ان میں نہیں۔ اور دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہوئے انہیں شرم آتی ہے۔ اس لیے انھوں نے بیچ کا ایک غیر معقول طریقہ اختیار کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں میں شامل بھی ہوتے ہیں، ترقی اسلام کے آرزومند بھی بنتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے درد میں تڑپتے بھی ہیں، اور دوسری طرف اسلام کے خلاف وہ سب کچھ کہتے اور کرتے ہیں جو ایک غیر مسلم کہہ اور کر سکتا ہے، حدیث و فقہ تو درکنار قرآن تک پر نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رہتے، اور ان تمام بنیادوں پر ضرب لگا جاتے ہیں جن پر اسلام قائم ہے۔ ان حضرات کو دعویٰ ہے کہ ہم ارباب عقل (RATIONALISTS) ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم کوئی ایسی بات نہیں مان سکتے جو عقل کے خلاف ہو۔ ملاؤں پر ان کا سب سے بڑا الزام یہی ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ مگر خود ان کا حال یہ ہے کہ مذہب کے معاملہ میں صریح متناقض باتیں کرتے ہیں۔ متضاد طرز عمل اختیار کرتے ہیں، اور اپنی ایک بات کی تردید خود اپنی ہی دوسری بات سے کر جاتے ہیں۔ آخر یہ ریشنلزم کی کون سی قسم ہے جس کی ایجاد کا شرف ان روشن خیال محققین کو حاصل ہوا ہے؟

اب ذرا ان کی معلومات کی وسعت اور فکر کی گہرائی ملاحظہ فرمائیے:۔

اسلام کی ترقی کے لیے آپ ضروری سمجھتے ہیں کہ مسیحیت کی طرح اسلام سے بھی شرعی حدود اڑا دی جائیں، اور اسلام صرف ایک عقیدہ کی حیثیت میں رہ جائے۔ کیونکہ مسیحیت کی ترقی کا راز جو آپ نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حرام و حلال کی قیود نہیں ہیں، اخلاقی پابندیاں نہیں ہیں، اس میں آدمی کے "حقوق انسانی سلب کر کے اس کو ایک لاشۂ بے جان اور بے بس بچہ" نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ اس کو آزادی دی گئی ہے کہ مسیح پر ایمان رکھ کر جو چاہے کرے۔ مگر آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ اسلام جس چیز کا نام ہے وہ قرآن میں ہے، اور قرآن نے

ایمان و عمل صالح کے مجموعہ کا نام اسلام رکھا ہے، عمل صالح کے لیے قیود مقرر کی ہیں، قوانین بنائے ہیں، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل نظام عمل مقرر کیا ہے جس کے بغیر اسلام بحیثیت ایک دین اور ایک تہذیب کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اس نظام اور اسکی حدود کو منسوخ کرنے کا اختیار کسی مسلمان کو نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا نسخ قرآن کا نسخ ہے، اور قرآن کا نسخ اسلام کا نسخ ہے، اور جب اسلام خود ہی منسوخ ہو جائے تو "اسکی ترقی" کے کیا معنی؟ آپ خود کسی مذہب کو ایجاد کر کے اسکی اشاعت فرما سکتے ہیں، مگر جو چیز قرآن کے خلاف ہے اسکو اسلام کے نام سے موسوم کرنے، اور اس کی ترویج کو اسلام کی ترقی کہنے کا آپ کو کیا حق ہے؟

آپ اسلام صرف اس عقیدہ کا نام رکھتے ہیں کہ "ہم آیندہ زندگی میں یا خود اس زندگی میں اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں اور ہونگے"۔ یہ بات غالباً آپ نے اس امید پر فرمائی ہے کہ اگر اسلام اس حد میں محدود ہو جائے گا تو بالکل نرم اور آسان ہو جائے گا۔ اور خوب پھیلتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر آپ اس عقیدہ کے معنی پر غور فرماتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اس حد میں محدود ہونے کے بعد بھی اسلام آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدے کو مذہب قرار دینے کے لیے سب سے پہلے تو حیات اخروی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پھر جوابدہی کا مفہوم تین باتوں کا متقاضی ہے ایک یہ کہ جس کے سامنے جوابدہی کرنی ہے اسکو متعین کیا جائے، اور اسکی بالادستی کو تسلیم کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جوابدہی کی نوعیت متعین کی جائے اور زندگی کے اعمال میں اس لحاظ سے امتیاز کیا جائے کہ کن اعمال سے اس جوابدہی میں کامیابی نصیب ہوگی اور کون سے اعمال ناکامی کے موجب ہونگے۔ تیسرے یہ کہ جوابدہی میں کامیابی اور ناکامی کے جدا جدا نتائج متعین کیے جائیں، کیونکہ اگر ناکامی کا نتیجہ بھی وہی ہو جو کامیابی کا ہے، یا سرے سے دونوں کا کوئی نتیجہ ہی نہ ہو تو جوابدہی بالکل بے معنی ہے۔ یہ اس عقیدہ کے عقلی لوازم ہیں جس کو آپ اصل دین قرار دے رہے ہیں۔ اگر آپ کی تجویز کے مطابق اسی عقیدہ پر اسلام کو قائم کر دیا جائے، تب بھی وہی مصیبت پیش آئے گی جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ پھر بھی خدا کو ماننا لازم آئے گا جس کے بغیر جاپان آپ کو ترقی کے بام پر چڑھتا ہوا نظر آیا تھا۔

پھر وہی شریعت کی بیڑیاں اور اخلاق کی حدیں بن جائیں گی جن کو آپ توڑنا چاہتے ہیں اور جن کے وجود میں آپ کے نزدیک اسلام کے ترقی نہ کرنے کا راز پوشیدہ ہے۔ پھر وہی عذاب و ثواب کا جھگڑا آ نکل آئے گا اور خدا کی بے شمار خلقت کو اس عقیدے کے بغیر خوش و خرم و خوش حال دیکھ کر آپ کا دل پھر اس بات پر گواہی دینے سے انکار کرے گا کہ چند سال بعد یہ سب عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

براہ کرم اب ذرا غور کر کے کسی ایسی چیز کا نام اسلام رکھیے جس میں کسی قسم کی قید و بند نہ ہو، جس کو ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ یکساں ہو، جس میں صرف خدا کی زمین کو معمور کر دینا دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے کافی ہو، اور جس پر ایمان نہ لانے والی بے شمار خلقت کو خوش و خرم و خوش حال دیکھ کر آپ کا دل گواہی دے سکے کہ وہ سب جنت کی بلبلیں بن جائیں گی۔"

قرآن کی رو سے سور کے گوشت کا قطعی حرام ہونا آپ کے نزدیک مسلم نہیں ہے۔ آپ شک فرماتے ہیں کہ شاید یہ اہل عرب کے لیے کسی خاص وجہ سے حرام کر دیا گیا ہو۔ لیکن اگر آپ اس رائے کو ظاہر کرنے سے پہلے قرآن کھول کر پڑھ لیتے تو اس شک کی تحقیق ہو جاتی۔ اس کتاب میں صاف لکھا ہوا ہے کہ:-

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی
طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَۃً اَوْ دَمًا
مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّہٗ رِجْسٌ
اَوْ فِسْقًا اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ
بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (۱۸۱۶)

اے پیغمبر! کہو کہ میری طرف جو وحی بھیجی گئی ہے اس میں کسی چیز کو
کہ جسے کوئی کھانے والا کھائے، میں حرام نہیں پاتا الا یہ کہ وہ
مردار ہو یا بہا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو، کیونکہ وہ
بتحقیق ناپاک ہے، یا نافرمانی کے طور پر اللہ کے سوا کسی
اور کے نام سے ذبح کیا گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبور ہو گیا بغیر اس
کے کہ وہ نافرمان اور حد ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو، تو تیرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں سور کے گوشت کو ہر "طاعم" یعنی کھانے والے کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے، اور حرمت

کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ "رجس" (ناپاک) ہے۔ کیا یہاں طاعم سے مراد عرب کا طاعم ہے؟ اور کیا ایک ہی چیز عرب کے لیئے رجس اور غیر عرب کے لیے طیب وطاہر ہوسکتی ہے؟ اور کیا اسی طریقہ سے آپ مردار کھانے والوں کے لیے بھی ذرا ڈھیل دینا پسند فرمائیں گے؟ آپ سور کے معاملہ میں ڈھیل دینا چاہتے ہیں تو اپنے اختیار سے دیجئے۔ مگر قرآن کے صریح الفاظ کے خلاف آپ کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ قرآن سے اسکی قطعی ممانعت مشکوک ہے؟

آج کل کے نئے مجتہدین نے اجتہاد کے جو اصول وضع کیئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلام کے جس حکم کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق بلا تکلف کہہ دیتے ہیں کہ یہ حکم خاص اہل عرب کے لیئے تھا، خواہ قرآن میں اس تخصیص کی طرف کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی نہ ہو، اور تخصیص کے لیے وہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ رکھتے ہوں۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو بعید نہیں کہ ایک روز قرآن ہی کو اہل عرب کے لیے مخصوص نہ کر دیا جائے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے استدلال اتنا لطیف ہے کہ صاحب سفرنامہ کے علم وفضل کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ غالباً اس آیت کا ترجمہ انھوں نے یہ کیا ہوگا کہ "جب سور کا گوشت کھانے کو بے اختیار جی چاہے تو کھالو مگر باغ میں بیٹھ کر کھانا اور نہ اسکی عادت ڈال لینا"۔

سور کے گوشت کے معاملہ میں اہل یورپ اور اہل چین کے لیئے ڈھیل دینے کی گنجائش اس آیت سے وہی شخص نکال سکتا ہے جو نہ اضطرار کے معنی جانتا ہو، نہ باغی کا مفہوم سمجھتا ہو اور نہ عادی کا۔ ورنہ جاننے والے کے لیے تو اتنی جرأت کرنا بہت مشکل ہے۔ آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کو مردارخواری یا خون آشامی کا چسکا لگا ہوا ہو یا جو لوگ سور کے گوشت پر جان دیتے ہوں، یا جن کے ہاں مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے کھانے کا عام دستور ہو وہ سب مضطرین میں داخل ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تحریم کا حکم ہی بے معنی ہو جاتا کیونکہ اگر تحریم ان لوگوں کے لیے تھی جو ان چیزوں کے خوگر تھے، تو استثناء سے فائدہ اُٹھا کر وہ اپنی عادت کے مطابق انھیں کھاتے رہتے، اور اگر تحریم ان لوگوں کے لیے تھی جو خود ہی ان سے مجتنب تھے تو ان کے لیے اس حکم کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اضطرار کے ساتھ غیر باغ ولا عاد کی شرط لگا کر جو استثناء کیا گیا ہے اُسکا

مفہوم تو یہ ہے کہ جو شخص بھوک سے مر رہا ہو، اور حرام چیز کے سوا کوئی چیز اس کو نہ ملتی ہو، وہ محض جان بچانے کے لیے حرام چیز کھا سکتا ہے، بشرطیکہ حد رخصت سے تجاوز نہ کرے، یعنی جان بچانے کے لیے جتنی مقدار ناگزیر ہو اس سے زیادہ نہ کھائے، اور حدود اللہ کو توڑنے کی اس میں خواہش نہ ہو۔ اس بات کو ایک دوسری جگہ سود اور مردار وغیرہ چیزوں کی تحریم کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا گیا ہے فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ یعنی جو شخص بھوک کی شدت سے مجبور ہو جائے بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف کوئی میلان ہو، وہ اس حالت میں حرام چیز کھا سکتا ہے۔ کہاں یہ بات اور کہاں وہ کہ اہل یورپ اور اہل چین چونکہ سور کے گوشت پر جان دیتے ہیں لہٰذا فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے فائدہ اٹھا کر ان کے لیے سور کو جائز کر دیا جائے، اور وہ بھی اس لیے کہ وہ اسلام میں داخل ہو سکیں۔ اگر اسی طریقہ سے ہر قوم کی رغبتوں اور خواہشوں کا لحاظ کر کے اسلام کے قوانین میں ڈھیل دینے کا سلسلہ شروع ہوا تو شراب، جوا، زنا، سود اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو بھی ایک ایک کر کے حلال کرنا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے احکام کو ماننے اور اس کے قائم کئے ہوئے حدود کی پابندی کرنے اور اس کے حرام کو حرام سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں ان کو اسلام میں داخل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اسلام ان کا محتاج کب ہے کہ وہ ان کو راضی کرنے کے لیے کم و بیش پر سودا کرے؟۔

پہلے تو صرف سور کے گوشت کی علتِ حرمت آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر پھر جو آپ نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اصولِ معدہ اور محرکات اخلاق میں بونِ بعید ہے، لہٰذا آپ نے یہ رائے قائم فرمائی کہ مذہب کو سرے سے حرام و حلال کا امتیاز ہی قائم کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس ارشاد سے یہ راز فاش ہو گیا کہ آپ جو کچھ قرآن کے متعلق جانتے ہیں، حکمت طبیعی PHYSICAL SCIENCE کے متعلق اس سے کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ قرآن سے ناواقف ہونا تو خیر ایک روشن خیال تعلیم یافتہ آدمی کے لیے شرمناک نہیں ہے، مگر سائنس سے اتنی بے خبری البتہ بہت شرمناک ہے۔ آپ کو اب تک یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ انسان کے نفس اور اس کی ترکیب جسمانی کے درمیان

کیا تعلق ہے، اور اس کی ترکیب جسمانی غذا سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ مذہبی نظریہ کی رو سے تو خیر نفس اور جسم دو علیحدہ چیزیں ہیں اور ان کے درمیان صرف تعامُل ہوتا ہے، لیکن سائنس تو نفس کو سراسر جسم ہی کی مخصوص ترکیب کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے جو چیز جسم کو اس کے اجزاء ترکیبی فراہم کرتی ہے اس کا اثر نفس کے خصائص پر مترتب ہونا بالکل ناقابل انکار ہے۔ جس طرح سور کے نفسانی خصائص میں اسکی ترکیب جسمانی کا یقینی دخل ہے، اسی طرح جسم کے واسطے سے انسان کے نفس پر سور کے گوشت کا اثر پڑنا بھی یقینی ہے۔ اگر آپ غذا کے متعلق سائنس کی جدید ترین تحقیقات کا مطالعہ فرماتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اخلاق پر غذا کا اثر اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، اور حکماء اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں کہ مختلف قسم کی غذاؤں سے ہمارے اخلاق اور ہماری ذہنی قوتوں پر کیا اثرات پڑتے ہیں۔